ملبے سے ملی چیزیں

نصیر احمد ناصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ملبے سے ملی چیزیں

ملبے سے ملی چیزیں

نظمیں

نصیر احمد ناصر

سانجھ پبلی کیشنز، لاہور

ملبے سے ملی چیزیں ___ شاعری ___ نصیر احمد ناصر

سانجھ پبلیکیشنز نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور‘ سے چھپوا کر‘
46/2 مزنگ روڈ‘ لاہور‘ پاکستان‘ سے شائع کی۔

نام کتاب : ملبے سے ملی چیزیں
شاعر : نصیر احمد ناصر
اشاعتِ اوّل : جنوری ۲۰۱۳ء
سرورق : سعید ابراہیم
قیمت : ۲۵۰ روپے

Malbey sey mili cheezein
(Urdu Poetry by Naseer Ahmed Nasir)

Copyright © 2013 - 1st Edition

Except in Pakistan this book is sold subject to the condition that it shall not, by way of trade or otherwise, be lent, resold, hired out or circulated without the consent of the author or the publisher in any form of binding or cover other than that in which it is published.

Printed by:
Shirket Printing Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 250.00

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

Published by:

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-082-3

شریکِ حیات رفیعہ کے لیے

نظمیں

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۲ء)

فہرست

راستہ اور ماں ۱۳
کئی دن سے آنکھوں میں آنسو نہیں تھے ۱۷
نغمۂ بیابانی ۱۹
انھیں مت بتانا! ۲۲
ابد کے پرندو! ۲۳
ہم ستارہ ۲۵
راک وال ۲۸
فلیکا ۲۹
کیا اب میری باری ہے؟ ۳۲
کوئی تیز نیلا بہاؤ مجھے کاٹتا ہے ۳۳
تاریخ ٹسوے بہائے گی ۳۷
ڈسٹ بن سے موت جھانکتی ہے ۳۹
اِن فوکس ۴۱
خون مایہ ۴۴

آزوقہ ۴۵
دیوارِ قہقہہ ۴۷
برزخ دھندلے خوابوں کا ۴۹
کنارے بہت ہیں ۵۱
یاد بھی آ ۵۳
کباڑ ۵۵
ایک دن کا یوٹوپیا ۵۷
ایک عام سی ڈیٹ ۵۹
مجھے ایک سپنے نے گھیرا ہوا ہے ۶۲
گدھے پر سواری کا اپنا مزہ ہے ۶۳
میں اندھیرے میں اگی مشروم ہوں ۶۷
روشن لمحے کا گیت ۷۰
پھولوں، پھلوں اور سبزیوں کے لیے ایک نظم ۷۱
شاعر کا دل ۷۳
پھاگن چیتر کے آتے ہی…… ۷۵
وہ دن تیری یاد کا دن تھا ۷۷
آشوبِ عمر میں خواہش کب مرتی ہے ۷۹
چابی ۸۳
تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے ۸۵
Dead-end ۸۸

کسی دن چلیں گے ۸۹
الغیاث ۹۱
تصویر کے آنسو ۹۳
Bonfire ۹۵
اب مِری آنکھیں نہیں ہیں ۹۷
خودکُش ۹۹
مرگِ آسان ۱۰۱
پن گھاؤ ۱۰۵
دائم انتظار میں رکھی ہوئی نظم ۱۰۷
یاد کی خوشبو ۱۱۳
کشکولِ ازل ۱۱۵
کہیں ایک رستہ ملے گا ۱۱۸
کوئی خواب آنکھوں سے آگے بھی جاتا ۱۲۱
تم تو ہم سے ملنے آئے تھے ۱۲۴
اناپ ۱۲۷

راستہ اور ماں

عجب راستہ تھا
کہ جو ہر طرف جا رہا تھا
مگر پھر بھی بے سمت تھا
دھوپ تھی، دُھول تھی
یاد جیسی کوئی بھول تھی
ماں اٹھائے ہوئے چل رہی تھی مجھے
پاؤں جوتوں سے عاری تھے
سر کی ردا مجھ پہ تانے ہوئے
ہاتھ سُن تھے
مری سانس سے تیز تر اُس کی رفتار تھی

راستہ، ایک سے دوسرے کوس تک پھیلتا جا رہا تھا
مگر فاصلہ تھا کہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا
طبیبِ ازل دیکھتا تھا

کوئی روگ تھا جان لیوا
کسی دکھ کی چنتا کسی پیڑ کی چھاؤں میں اُس کو رُکنے نہ دیتی تھی
پَل بھر بھی تھکنے نہ دیتی تھی اُس کو
سحر دم سے جاگی ہوئی تھی
مگر چل رہی تھی
اٹھائے ہوئے مجھ کو ہاتھوں پہ اپنے
کوئی تیز نوکیلے پنجوں، بڑے پنکھوں والا پرندہ تھا
جو میرے چھوٹے سے دل سے کہیں دُور اُڑنے کو بے حال تھا
اور کسی ڈاکٹر کا، کلینک کا کوئی نشاں تک نہیں تھا
زمیں تو زمیں آسماں تک نہیں تھا
کسی ویدِ اعظم، حکیمِ جہاں کے مکاں کا پتا بھی نہیں مِل رہا تھا
مسیحا بھی کوئی نہیں تھا
جو اپنے زماں سے نکل کر
مِری آخری سانس لیتی ہوئی ننھی بیمار صدیوں میں آتا
صلیبِ اذیت اٹھاتا
مِری جاں کے بدلے سبھی ماؤں کے دکھ مٹاتا،

شفاعت کنندہ ہی بنتا

عجب راستہ تھا
جو زیرِ زمیں تھا، پسِ آسماں تھا، کہیں تھا
مگر ماں کو مِلتا نہیں تھا
عجب دکھ کی شدت تھی جس میں
ہر اک شے تھی ساکت
کوئی پتا ہِلتا نہیں تھا
بس اک سانس تھی جو ابھی چل رہی تھی
ہوا تھی جو رُک رُک کے پہلو بدلتی تھی لیکن،
ہوا بھی کہاں تھی،
کبھی ایک سے دوسرے گاؤں ماں تھی جو پیہم رواں تھی
کہ اُس کو خبر تھی
یہ رستہ بہت دُور جائے گا
رُک کر بھی چلتا رہے گا
مجھے زندہ رکھنے کی خاطر
خدا کائناتوں کی حکمت بدلتا رہے گا

زمانے کا پہیہ بہت تیز ہے
گھومتے گھومتے تھک گیا ہے

مرے ساتھ بگ ٹٹ وہ بچہ بھی بوڑھا ہوا ہے
مگر ماں ابھی تک چلے جا رہی ہے
اٹھائے ہوئے مجھ کو ہاتھوں پہ اپنے
ازل سے ابھی تک تعاقب میں مرگِ نہاں ہے
وہی جانتی ہے
کہ رستے کا انتم کنارا کہاں ہے......!

کئی دن سے آنکھوں میں آنسو نہیں تھے

یہاں کوئی نم دار آنکھوں سے چھن بھر بھی دیکھے
تو لگتا ہے بارش سی ہونے لگی ہے
گھنے بادلوں میں سمندر ہمکنے لگا ہے
مجھے تم بتاؤ
کہ چُپ چاپ جیون کی ہر سمت بہتے ہوئے پانیوں کو
کہاں تک چھپاؤں گا میں
اَن کہی داستانیں کہاں تک سناؤں گا میں
زندگی کے زمیں دوز رستوں پہ کب تک چلوں گا
ابد خیز خوابوں کو دیکھوں گا کب تک
تمہارے گھنے سبز نادیدہ باغوں کی چھاؤں میں کب تک جلوں گا

تمہاری محبت کے چہرے پہ آنکھیں نہیں ہیں
یہ صدیوں پرانے اندھیرے کے خستہ مکانوں کے پیچھے، درختوں کے نیچے
جہاں ہم ذرا دیر باتوں کے چھینٹے اڑاتے ہوئے آ گئے ہیں
یہاں چند سائے ہمارے لیے روشنی لا رہے ہیں
پرندے ہمارے لیے گا رہے ہیں
یہ لمحے جو بوڑھے زمانوں کے بچے ہیں
چھپ کر ہمیں دیکھنے آ گئے ہیں
مگر تم بتاؤ
کہ عمریں کہاں تک ہمارے لیے سانس لیتی رہیں گی
کسی دن کہیں گی
چلو اب بہت جی لیا ہے
ڈرائیور اٹھاؤ یہ سامان سارا
چلو پورٹیکو میں گاڑی کھڑی ہے
مجھے تم بتاؤ میں لفظوں کے کیپسول کھا کھا کے کب تک جیوں گا
یہ نظموں کا سیرپ بھی کب تک پیوں گا
یہ ملبوسِ انفاس کامل ہی اب پھٹ چکا ہے
اسے اور کتنا سیوں گا......!

نغمہء بیابانی

ہوا روز قصبے کی کہنہ حویلی کا در کھولتی ہے
زمانے کی بوسیدگی سے
کوئی روح آزاد ہوکر
مجھے اوڑھ لیتی ہے
اپنے علاقے سے نکلا ہوا اجنبی میں،
مِرا جسم بارانی رستوں، زمینوں میں خودرو
جڑی بوٹیوں کی طرح پھیلتا پھولتا
نیم شاداب کھیتوں کی بے آبیوں سے گذر کر
کسی تیز برساتی نالے میں گرتا ہے
سیرابیوں کی کہانی کئی موڑ مڑتی ہے

دریا کی طغیانیوں میں
کئی رس کی باتیں ہیں، گھاتیں ہیں
جنگل ہیں، بیلے ہیں، صدیوں پرانے کٹاؤ ہیں
گھاؤ ہیں، گہرے بہاؤ ہیں
اپنے بہاؤ میں خود ڈوبنے کی تمنا عجب ہے
ہوا جانتی ہے

ہوا جانتی ہے
مرے ساتھ یادوں کا میلہ ہے، عمروں کی وارفتگی ہے
جواں سال لمحوں کی رونق ہے،
بوڑھے زمانوں کی افسردگی ہے
خوشی ہے، غمی ہے
ارادوں سے بھرپور دن کی مشقت ہے
بےخواب شب کی سیاہی ہے
فطرت کی بے پایاں دولت ہے
سورج کا سونا ہے، تاروں کی چاندی ہے
نیلے تحیر سے لب دوز ولب ریز، پھیلا ہوا آسماں ہے
افق کے کنارے پہ روٹی نما چاند ہے
لالٹینوں کی کم روشنی ہے
الاؤ ہیں

خانہ بدوشوں کے ڈیرے ہیں
ناقہ سواروں کی پرچھائیاں ہیں
ہوا جانتی ہے

ہوا جانتی ہے
مِرے دل سے لپٹی ہوئی ایک وعدے کی رسی ہے
آنکھوں میں ٹوٹا ہوا ایک عہدِ محبت ہے
خوابوں کی مٹی ہے
بے موسمی بارشوں کی نمی ہے
مجھے کیا کمی ہے
ہوا جانتی ہے
پرانا میوزک سناتی، اداسی کو ڈی کوڈ کرتی
ہوا وائلن کی طرح
مجھ سے میرے قدیمی دکھوں کی زباں بولتی ہے
ہوا روز قصبے کی کہنہ حویلی کا در کھولتی ہے!

اُنھیں مت بتانا!

اُنھیں مت بتانا میں رویا تھا
کچھ دیر سویا تھا
کھڑکی سے باہر
جسے ایک منظر کی آنکھوں میں بویا تھا
میں نے
سڑک کے کنارے کھڑا تھا
ابھی میں نے دیکھا
جو سب سے بڑا تھا
وہی پیڑ کاٹا گیا تھا
کسی گھر کی لابی سجانے
ٹریلر میں لد کر نہ جانے کہاں جا رہا تھا!

ابد کے پرندو!

ابد کے پرندو!
مِرے پاس آؤ
مِری چھت پہ بیٹھو
اُتر آؤ نیچے
اُتر آؤ، اتنی بلندی پہ اُڑنے کا حاصل فقط لازمینی ہے
دیکھو، یہی دُور بینی ہے
نیچے اُتر کر فلک سے
مِری چھت سے جھانکو زمیں پر
مِری بالکونی میں چہکو
مِرے گھر کے پیڑوں پہ اچھلو

ہر اک پھل کا رس چوس لو، خوب چونچیں بھی مارو
مِرے ساتھ کھیلو
مِرے لان میں کرسیاں ہیں
ابھی گھاس بھی سبز ہے اور تازہ تراشی ہوئی ہے
مگر بیٹھنے والے سب جا چکے ہیں
میں خود بھی کھڑا ہوں،
ابھی چل پڑوں گا
تمہارے پروں کی ہری پھڑ پھڑاہٹ سُنوں گا
تو کچھ دیر رک رک کے دیکھوں گا
پودوں کو، پھولوں کو، مہکے ہوئے منظروں کو
انہی منظروں میں کہیں میں بھی تھا، تم بھی تھے، زندگی تھی……

ابد کے پرندو!
مِرے پاس آؤ
نہیں تو مجھے پاس اپنے بلا لو
مجھے اپنے اجلے پروں کی ابد خیز چھایا بنا لو
مجھے اپنی کایا بنا لو
تمہیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں
میں اُڑنے لگا ہوں!!

ہم ستارہ

ہم ستارہ!
ہم ستارہ!
دید کی گہرائیوں میں
کون سی آنکھیں رکھی ہیں
دل کی آنکھیں
یا کسی سپنوں بھرے چہرے پہ چپکی
چھوٹی چھوٹی خوبصورت
گڑیا جیسی گول آنکھیں......؟

ہم ستارہ!

ہم ستارہ !
رات کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں
مگر دن کے اجالے میں دکھائی ہی نہیں دیتیں
سنا تم نے
کسی آواز کی کرنیں دہائی ہی نہیں دیتیں
جو زندہ ہیں
انھیں یادوں میں آنے کے لیے
مرنا پڑے گا
زندگی کی چھوٹی چھوٹی
دکھ بھری خوشیاں مگر ہم کو رہائی ہی نہیں دیتیں
ذرا جلدی چلو، اب وقت کم ہے
کاغذوں کے ڈھیر میں گم روشنی کا دم گھٹے گا
کچھ ہمیں اس کے لیے کرنا پڑے گا

ہم ستارہ !
ہم ستارہ !
دن کی آنکھیں کس قدر ویران ہیں
بادل بہت نیچے اتر آئے ہیں
چاہو تو پکڑ لو ہاتھ سے
سورج ابھی گزرے گا

بھاری تیز قدموں سے لڑھکتا بھاگتا
پتّوں بھرے فٹ پاتھ سے
کھڑکی کھلی
ہے
دیکھنا مت !
دیکھنا مشکل
ہے
اپنی آنکھ کی بینائیوں میں
ہم ستارہ !
ہم ستارہ !
کون سی آنکھیں رکھی ہیں
دید کی گہرائیوں میں......؟

راک وال

چہرے اور آنکھیں تو
باہر کا چمکارا ہیں
یاد کے آنسو
درد کے رشتے
اندر خانے
سب کچھ گردا جاتا ہے
پینٹ نیا ہو جانے پر
باہر سے گھر
خوب نظر آتا ہے!

فلیکا

فلیکا!
یہاں میں کھڑا ہوں
سرِ شب
تمہیں یاد کرتا ہوں
ہر سُو اندھیرے کی رالیں ٹپکتی ہیں
لمبی، ہری گھاس میں
سرسراتے ہوئے واہمے مجھ کو بے چین کرتے ہیں
آنکھوں میں آنسو ہیں
دل میں امنڈتے ہوئے بادلوں کا سماں ہے

فلیکا!
چھلاوا ہو، آسیب ہو، آتما ہو
کہ سرگوشیوں میں ڈھلی ہنہناہٹ کی بے چارگی ہو
جہاں بھی کھڑی ہو، مِری خامشی سن رہی ہو؟

فلیکا!
تمہیں کچھ کہوں گا
تو تم بھاگ جاؤ گی
شاداب کھیتوں، پہاڑوں کے اونچے کناروں،
عمودی ڈھلانوں،
گھنے جنگلوں، پُر خطر راستوں میں بھٹکتی پھرو گی
کوئی باگھ آئے گا
تم کو ڈرائے گا، زخمی کرے گا
دھواں دھار سی بارشوں میں
تمہارے لہو کی الم ناک دھاریں بہیں گی

فلیکا! فلیکا!
بہت تھک گیا ہوں
کہیں سو نہ جاؤں
کہیں کھو نہ جاؤں

فلیکا!
مرے غم کی منزل نہ جانے کہاں ہے
بڑی خوبصورت ہے دنیا
مگر بے اماں ہے......!!

Mir Zaheer abass Rustmani
03072128068

کیا اب میری باری ہے؟

ہنستے کھیلتے
واک پہ جاتے
باتیں کرتے
کافی پیتے
نظمیں لکھتے
موت نے مجھ کو
زندہ دیکھ لیا ہے!

کوئی تیز نیلا بہاؤ مجھے کاٹتا ہے

تمہیں میں بتاؤں،
مِری ساری چیزیں سمندر کے دل میں پڑی ہیں
مِرے سب خزانوں،
مِری ساری بھیدوں بھری زندگی کا محافظ
یہ بوڑھا مجاور، سمندر
بڑا صبر والا، بڑی عمر والا ہے
صدیوں سے دنیا کا سارا نمک اپنے اندر سموئے ہوئے ہے

مِرے بادبانوں کے مستول ٹوٹے،
مِرے زنگ خوردہ دُخانی جہازوں،

مِری آبدوزوں کو ڈوبے،
زمانہ ہوا ہے
مگر ساحلوں پر ابھی تک
کئی لوگ لہروں سے میرا پتا پوچھتے ہیں
کئی عورتیں اپنے ناکردہ وعدوں کی چاندی،
سیہ پوش جسموں کا سونا
ہواؤں کے بے شکل، بے سایہ معبد کے بوڑھے پجاری کے
قدموں پہ رکھتی ہیں
میرے لیے زندگی کی دعا مانگتی ہیں

میں اپنے ہی بے عکس دکھ کے
بہت گہرے پانی سے لرزاں و ترساں
کہیں دُور ویران تٹ پر
محبت کی لاحاصلی میں
کسی یوگ شکتی کی خواہش لیے چل رہا ہوں
مِرے دل میں رستے بہت ہیں
کوئی چلنا چاہے تو چلتا رہے عمر بھر
منزلوں کی تمنا عبث ہے..........
مگر ایک خوابِ حقیقت کی پاداش میں جی رہا ہوں
صداقت کا سیرم (نیابِ صداقت) بھی اتنا لِیا ہے

کہ سچ بولتے بولتے تھک گیا ہوں

یہ دنیا مِری ریگِ غم سے سنہری طلا چھانتی ہے
مِرے خاک زاروں، مِرے آسمانوں کو حیرت بھری آنکھ سے دیکھتی ہے
مِرے بادلوں کی بدلتی ہوئی خواب شکلوں میں
اپنی نمی خور گیلی شبیہوں کی بے ہیئتی جوڑتی ہے

میں اپنے کناروں میں لبریز اتنا ہوں
آنکھیں چھلکنے کو بس اک جھلک مانگتی ہیں
جھلک ایک غم کی
جسے میں نے پہلے، کبھی پہلے دیکھا نہ ہو......
غم کا چہرہ مگر کس نے دیکھا بجز میرے
خوابوں کے چلنے کی آواز بھی دردآمیز راتوں کے گاڑھے اندھیرے میں
میرے علاوہ کسی کو سنائی نہیں دی
میں تنہا ہی روتا رہا ہوں

مِری بند ہوتی وریدوں میں اب ایک کاغذ کی کشتی رواں ہے
جسے میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے احتیاطاً بنایا تھا
(لائف بوٹس ہر شِپ میں ہوتی ہیں)
لیکن تمہیں بھی پتا ہے

کہ قرنوں پرانی گذرگاہِ ہستی کے آبی سفر میں
بہت کچھ ہی دھندلا گیا ہے
وہ جس کا طلسمی کچھاؤ
یہاں لے کے آیا تھا ہم کو
وہ ٹاپو قریب آ گیا ہے
مگر وہ کہاں ہے.......... کہاں ہے؟
جسے حاصلِ وقت مانا گیا تھا، وہ لمحہ کہاں ہے؟

زمانہ مجھے اپنی بے رحم آنکھوں سے کیوں دیکھتا ہے
میں اک خواب ہوں، میری تعبیر بھی خواب سی ہے
کوئی میرے دل کی حقیقت کہاں جانتا ہے
چٹانی کنارا ہوں اپنے سمندر کا خود ہی
کوئی تیز نیلا بہاؤ مجھے کاٹتا ہے
تمہیں اپنے خوابوں کی سچائیوں پر یقیں ہے
بتاؤ! مِری زندگی کا ستارہ کہاں ٹوٹتا ہے......؟

تاریخ ٹسوے بہائے گی

تم سرِ بام آ کر
اٹھایا ہوا ہاتھ اپنا ہلا کر
چمک دار آنکھوں سے اپنی
مجھے رخصتی کا اگر اذن دیتیں
تو میں دشمنوں کے لیے
موت بن کر نکلتا
تمہارے فقط اک اشارے سے
کشتوں کے پشتے لگاتا چلا جاتا
تم دیکھتیں کس طرح میں
زمانے کی سرحد ذرا دیر میں پار کرتا

ہر اک سمت سے وار کرتا
محبت کی تاریخ تبدیل کرتا
نئی رزم بوطیقا تشکیل دیتا
میں لشکر کا سب سے بہادر سپاہی تھا
میرے لیے ایک آنسو بہت تھا
مگر تم نے اشکوں کی برسات کر کے
مجھے اس قدر غم زدہ کر دیا ہے
کہ لگتا ہے یہ معرکہ ہار جاؤں گا میں
لوٹ کر اب نہ آؤں گا میں ......!

ڈسٹ بِن سے موت جھانکتی ہے

تمہارے لیے میں خوشی کو تلاشوں گا
ڈھونڈوں گا غم کو
انہی ٹین ڈبوں میں، کچرے کے ڈھیروں میں
ٹوٹی ہوئی بوتلوں، شاپروں میں
کئی میلے کچیلے زمانوں کے آدرش ہوں گے
یہیں پر کہیں زندگی کی دھنک رنگ ساعت بھی ہوگی
یہیں پر کہیں ہم کو گڑیا کی آنکھیں ملیں گی
پھٹے سرخ ملبوس، سلمہ ستارے ملیں گے
تمہارے زمیں بوس ماتھوں پہ بچو!
یقیناً کسی دن کبودی فلک کے کنارے ملیں گے

یہیں شاعری کی پرانی کتابوں کے اوراق ہوں گے
محبت کے جذبات، نفرت کے چقماق ہوں گے
گلے پھل، سڑی باسی روٹی کے ٹکڑے
سبھی کچھ ملے گا

اِسی ڈسٹ بن میں
کئی کائناتوں کے پھینکے ہوئے خشک و نم دار فضلے
یہیں پر اداسی کا ملبہ پڑا ہے
یہیں چھوٹی موٹی سی بے کار چیزوں کے نیچے چُھپی دیکھتی ہے
الم ناک راتوں کی تنہائی ہم کو
یہیں پر دنوں کا اجالا بھی ہوگا
یہیں خواہشوں کے غبارے اُڑائیں گے
کاریں، ٹرینیں بھگائیں گے
سورج کو فٹ بال، تاروں کو گیندیں بنائیں گے
کھیلیں گے مل کر
مگر تم نہ چھیڑو، خدا کے لیے مت اٹھاؤ!
غلاظت کے انبار میں گُپت ہوتے کھلونا نما ایک خودکار بم کو!!

اِن فوکس (IN FOCUS)

تم کس خواب کے چوبارے پر
آنکھیں لے کر آ بیٹھے ہو
بُرجی بُرجی نشست لگائے
کس منظر کو دیدار کے عدسے پہناتے ہو
کس کے آنے کی آس لگا بیٹھے ہو
رستہ ایک دکھاوا ہے
مٹی کا پچھتاوا ہے
قدموں کا الجھاؤ، خواہش کا گھاؤ ہے
پچھّم، پورب، دکھن، پربت
بے سمتی کا ٹکراؤ ہے

بہتر ہے بس سامنے دیکھو……
نیندوں کے دریا میں
سورج کی ناؤ بہتی ہے
ہلکی دھوپ کی چادر اوڑھے
شام کنارے پر بیٹھی ہے
حدِ نظر تک اور بظاہر نیلا شانت سبھاؤ ہے
کافی کی مہک ہے، خنکی ہے، رچاوٹ ہے، رچاؤ ہے……
تم کو کس نے روکا ہے
فوکس کر کے بے شک دیکھو
بستی کی چاروں جانب
ایک طلسمی دھوکا ہے
حسن، ادائیں، رقص، میوزک
وصل کا در، دید جھروکا ہے
کھیل تماشے، فلم ڈرامے، ہیری پوٹر کی دنیا
حیرت افزا چیزیں ہیں
ساز و برگ انوکھا ہے
شاپنگ مال، پلازے، ہوٹل
مِنرل واٹر، لیموں پانی
کھیر، ٹرائفل، گاجر حلوہ، گرما گرم پلاؤ ہے
جو کچھ کھانا ہے کھاؤ

لینز گھماؤ اور گنجان نگر کے وسط میں جاؤ
رینگتے کیڑوں اور جرثوموں جیسی مخلوقِ خدا ہے
گلیوں اور مکانوں کا
دالانوں، ارمانوں کا لامتناہی پھیلاؤ ہے
سبزی منڈی، آٹو رکشے
جلسہ گاہیں، لیڈر، تقریریں، نعرے، وعدے، فتوے
پیٹ کا دوزخ خالی ہے
آٹے دال کا بھاؤ ہے
آتی پاتی کھیلتے لڑکے
بُرقع پوش جواں پیکر
کہنہ سال انسانی ڈھانچے
برسوں سے زیرِ مرمت سڑکوں پر
فینائل جیسی بدبو کا چھڑکاؤ ہے......
ہمت ہے تو آگے آؤ
کیمرہ لاؤ اور فلماؤ
ابھی ابھی بارود پھٹا ہے
لاشوں کا اک ڈھیر لگا ہے
آتش بازی کا شو ہے، رنگوں کا الاؤ ہے......
تم کس خواب کے چوبارے پر
آنکھیں لے کر آبیٹھے ہو......!

خون مایہ

(سرطانِ خون میں مبتلا بچوں کے لیے)

سفید ہے نہ سرخ ہے
تمہارے خوں کا رنگ
روشنی مثال ہے
ہر ایک رنگ زیست کا
اسی کا عکسِ پُر جمال ہے

لکھا ہوا تمہارے اس وجود میں
جو زندگی کا لفظ ہے
وہ موت سے وشال ہے!

آزُوقہ

ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہوسکتا ہے
گندم، چاول، دال، کماد
سبزی، پتے، ساگ، سلاد
چوکھر، بھوسہ، چارا، کھاد
جس کو روگ اناج کا لاگے
چین سے وہ پھر سوئے نہ جاگے
خواب، حقیقت سب کچھ تیاگے
چند نوالے حلق میں ڈالے
تل تل ناچے، پگ پگ بھاگے

پیٹ کی خاطر خوب اگاؤ
اپنے دیس کی شان بڑھاؤ
دھکے کھا کر، آنسو پی کر
درد کماؤ، دکھ بسراؤ
دُور دساور سے آتے ہیں
شہد، پنیر، کریکر، کافی
جیلی، جام، مربے، کیچپ
توتِ فرنگی، تونا مچھلی
سب کچھ کھاؤ، سب کچھ کھاؤ
ایک گلوب کے شہری سارے
بھوکے ننگے پیاس کے مارے
سرخ سیاست، زرد معیشت
ڈھلتی عمریں، چڑھتے بھاؤ
آنسو، آہیں، غم اور گھاؤ
ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے!

دیوارِ قہقہہ

دیکھو دیکھو!!
اوپر سے نیچے تک دیکھو
آگے سے پیچھے تک دیکھو
جنگل اور پہاڑ سے لے کر
گھر کے باغیچے تک دیکھو
چڑیا، باز، ہما اور ققنس
ہر پنچھی کی بینائی سے
حدِ فلک کی پہنائی سے
اُڑتے غالیچے تک دیکھو
شہروں میں، دیہات میں دیکھو

دن میں دیکھو، رات میں دیکھو
رستوں کی اطراف میں دیکھو
گدلے میں، شفاف میں دیکھو
اندر دیکھو، باہر دیکھو
پوشیدہ یا ظاہر دیکھو
دنیا کی اوقات میں دیکھو
اپنی اپنی ذات میں دیکھو
دیکھو دیکھو!!
اُس نادید کو ہر سُو دیکھو
کچھ بھی نظر نہ آئے جب تو
اک تجرید کو ہر سُو دیکھو
اور دیکھتے دیکھتے خوب ہنسو!!

برزخ دھندلے خوابوں کا

اک یاد قدیمی گلیوں کی
اک درد پرانا رستے میں
اک رنگ انوکھا کلیوں کا
اک پھول عجب گل دستے میں
اک گیت نباتی پتوں پر
اک بیل ستوں سے لپٹی ہے
اک صبح ازل سے چمکی ہے
اک شام ابد تک ٹھہری ہے
اک چاند رکا ہے کھڑکی پر
اک رات بہت ہی گہری ہے

اک دشت کا سینہ چھلنی ہے
اک ہاتھ پڑا ہے خنجر پر
اک زخم لگا ہے مٹی کو
اک سبز ردا سی بنجر پر
اک ہار گلابی بانہوں کا
اک برگد بوڑھی صدیوں کا
اک برزخ دھندلے خوابوں کا
اک عالم جاگتی نیندوں کا
اک عمر کا سارا قصہ ہے
دکھ درد خوشی کا حصہ ہے!

کنارے بہت ہیں

کہاں جا کے بیٹھیں
کہاں دل لگائیں
کہاں دید کا ڈول ڈالیں
کہاں وصل پائیں
کہاں ساتھ چھوڑیں
کہاں مِل کے کھیلیں
کہاں زخم کھائیں
کہاں درد جھیلیں
کہاں چھاؤں اوڑھیں
کہاں دھوپ تانیں

کہاں دھات کوٹیں
کہاں ریت چھانیں
کہاں دن گزاریں
کہاں رات کاٹیں
کہاں کچھ نہ بولیں
کہاں بات کاٹیں
سوالوں کے دھارے بہت ہیں
اجل کے اشارے بہت ہیں
زمیں پر سمندر نہیں ہے
افق کے کنارے بہت ہیں!

یاد بھی آ……!

جھیلوں جھرنوں والے
بارش لا
پھولوں کلیوں والے
باغ کِھلا
سبز شگوفوں والے
سرخ بنا
رنگوں رُوپوں والے
چھب دِکھلا
سُر سنگیتوں والے
گیت سنا

راتوں نیندوں والے
خواب جگا
چاند ستاروں والے
دیپ جلا
کونوں کھدروں والے
سامنے آ
آنکھ مچولی والے
کھیل رچا
برج مناروں والے
راس پہ آ
خوب نشانے والے
تیر چلا
دردوں زخموں والے
دکھ بسرا
نیلے کنٹھوں والے
زہر پلا
تین زمانوں والے
ایک میں آ
بھول بھلیوں والے
یاد بھی آ......!

کباڑ

رات کے لمبے کناروں سے پھسل کر
دن بکھرتے جا رہے ہیں ……
درد کے ملبے سے ملنے والی چیزیں
کس قدر بے کار ہیں
یادوں کے ٹکڑے جوڑ کر بھی کیا بنے گا!
خواب، آنکھیں، آنسوؤں میں تر بتر چہرے
دلوں کی دائمی افسردگی
آدھی ادھوری، ٹوٹی پھوٹی زندگی
قرنوں پرانی آگہی
اجڑے دریچوں، خواب گاہوں کی مجرّد خامشی

نم دار تنہائی
غصیلی عورتوں اور بارشوں کا شور
پتھر بیل
آسیبی دوپہریں، عاصفہ
بچپن کی ننھی خواہشیں
مٹی کے برتن، گولکوں کے پیٹ میں گُم ریزگاری
سال خوردہ راستوں میں
اَن گنت قدموں کے گڈمڈ سے نشاں……
لیکن زمانہ بھی کباڑی ہے
سبھی زنگار اور بیکار چیزیں
ڈھیر کرتا جا رہا ہے
دام بھرتا جا رہا ہے
ایک دن اس ڈھیر کی قیمت لگائی جائے گی
سب کچھ تُلے گا
وقت کے اصلی ترازو میں
ازل سے تا ابد پھیلی اداسی مول پائے گی
مگر کب……کون جانے
رات کے لمبے کناروں سے پھسل کر
دن بکھرتے جا رہے ہیں……!

ایک دن کا یوٹوپیا

یہاں سے دن شروع ہوتا ہے
شب کا خاتمہ
آگے سنہری دھوپ کا میدان ہے،
آگے، ذرا آگے شعاعوں کا سمندر ہے
یہاں سب کچھ چمکتا ہے
یہاں رستے بھی جوں روشن لکیریں ہیں
یہاں کی سیرگاہوں میں بچھا سبزہ
کسی تاباں ستارے سے زمیں کو تحفتہً بھیجا گیا تھا
دودھیا بادل مثالِ آئنہ ہیں،
عکس نادیدہ ہواؤں کے

عجب تابیدگی میں جھلملاتے ہیں، لرزتے ہیں
یہاں بارش بھی ہوتی ہے تو لگتا ہے
کہ جیسے نور کے موتی برستے ہوں
یہاں کے پھول، پھل، پتے
درختوں کے تنے، شاخیں
سبھی شفاف پانی سے دُھلے ہیں
سربسر اونچے پہاڑوں سے اترتی، شور کرتی ندّیاں لگتا ہے جیسے
روشنی کی آبشاریں ہوں
یہاں جتنے بھی پنچھی ہیں
سبھی بگلے ہیں
کوّے بھی اسی بہروپ میں رہتے ہیں
(پگلے ہیں، یہاں کی اصل کو اب تک نہیں سمجھے)
یہاں آتے ہی کالی رات سا ملبوس جسموں کا
سفیدی کے لبادے میں بدل جاتا ہے
آنکھیں خود بخود خوابوں کی حیرانی،
حقیقت کی برہنہ تابناکی دیکھ لیتی ہیں
یہاں پر دیوتاؤں کا، خداؤں کا تصور تک نہیں کوئی
یہاں انسان رہتے ہیں!

ایک عام سی ڈیٹ

تمہارے لیے میں وہ سب کچھ کروں گا
جو دنیا میں اپنے لیے بھی نہیں کوئی کرتا
مگر میں کروں گا، تمہارے لیے
پارک کے سارے پھولوں کو دیکھوں گا
توڑے بنا اُن کی تعریف کرتا رہوں گا
گھنے بادلوں کو بھلا کون سر پر اٹھاتا ہے اتنی لگن سے
مگر میں اٹھائے پھروں گا
ذرا بھی نہ اکتاؤں گا بارشوں سے
سمندر کو بھرتا رہوں گا
میں آنکھوں کے نمکین پانی سے

ساحل پہ لہروں کی توشک بچھا کر
جزیروں کی جانب ہوائیں روانہ کروں گا
انھیں تھوڑا نزدیک آ کر پسرنے کا پیغام بھیجوں گا
اونچے پہاڑوں کو ہموار رستوں کے دونوں طرف لا کے رکھ دوں گا
پیڑوں کو اترائیوں پر عمودی لگاؤں گا
دریا کو ایسے گزاروں گا پُل کے تلے سے
کہ پانی کو اپنی روانی پہ خود پیار آئے گا،
پُل کے ستونوں سے ٹکرانا اچھا لگے گا
کسی سرمدی خواب کی بارگہ میں
اگر باریابی ہوئی تو
تمھارے لیے میں مناظر سبھی مانگ لوں گا
طلسمی جہانوں کو کھوجوں گا
گزرے زمانوں سے گزروں گا
آگے کا سوچوں گا
سب کچھ کروں گا
کسی سے نہ ہرگز ڈروں گا
تمھارے لیے میں جیوں گا، تمھارے لیے ہی مروں گا
کسی اچھے ہوٹل میں کھانا بھی کھائیں گے
گپیں لگائیں گے
گھومیں پھریں گے

وہ سب کچھ کریں گے جو ایسی ملاقات پر لوگ کرتے ہیں
فی الحال لیکن
بڑی بھوک سی لگ رہی ہے
چلو سامنے کی دکاں سے ''شاورما'' ہی کھائیں!!

مجھے ایک سپنے نے گھیرا ہوا ہے

زمینوں سے چِپکے زمانے مجھے گھورتے ہیں
ہدف ہوں میں جن کا
وہ سارے نشانے مجھے گھورتے ہیں
نئے میرے ہونے سے نالاں
پرانے مجھے گھورتے ہیں
میں نیندوں کا رسیا، ازل سے
مجھے ایک سپنے نے گھیرا ہُوا ہے
کئی ایک دشمن ہیں لیکن
مجھے ایک اپنے نے گھیرا ہُوا ہے!

گدھے پر سواری کا اپنا مزا ہے

گدھے پر سواری کا اپنا مزا ہے
نہ گُر شہسواری کے، میدان ماری کے
آنے ضروری
نہ کاٹھی، لگامیں نہ کسنے کی حاجت
نہ چرمی کھڑاؤں، نہ چوپاؤں کے نیچے لوہے کے حلقے
نہ اسپیڈ اتنی کہ گرنے کا خطرہ
نہ قربت فلک کی
نہ مٹی سے دُوری
سرِ راہ، کھیتوں میں، گلیوں میں
ہر سمت جانے کی آزادگی، گھاس خوری

نہ منزل کی جلدی، نہ رکنے کی عجلت
نہ شرقی نہ غربی
نہ اسپ فرنگی نہ عربی
مگر چال دلکی
عجب شانِ درویشی، پیغمبرانہ صبوری
مسیحی، زبوری
نہ شہزادگی کی تمنا نہ شہزادیوں کی محبت، رقابت
نہ ملکہ کی وصلت نہ ڈر بادشہ کا
کنیزوں غلاموں کی سازش
نہ جلاّدِ شاہی کی تلوار سر پر
نہ گردن زنی، نیزہ بازی نہ پولو
نہ دربار و سرکار کی جی حضوری......

فلاطونی دانش نری خر دماغی ہے
انسانی فطرت ہمیشہ سے باغی ہے
خرکار صدیوں کی حکمت قدیمی
نمک اور کاٹن کا بزنس پرانا
بڑوں، بوڑھوں، بچوں کو ازبر کہانی
مگر غِلاظتوں سے بھرے
ندّی نالوں میں آبِ رواں کی کمی ہے

نئی مارکیٹوں میں پانی کا دھندا نیا ہے
بنفشے کا سیرپ نہ شربت بزُوری......
علی بابا چالیس چوروں کے قصے میں
دینار و درہم کے انبار
ہیرے جواہر کے مٹکے
بجز ایک خروار کچھ بھی نہیں ہے
زر و مال کی خیرگی، دیدہ کوری

وہ یک چشم دجّال آئے نہ آئے
ہے قربِ قیامت کی ہر شرط پُوری
صدا ڈھینچوں ڈھینچوں کی مسحور کُن ہے
ازل سے ابد تک نمایاں یہی ایک دُھن ہے
بظاہر سبک رو زمانے کی رفتار نوری
نہ دُم آدمی کی نہ خرطوم،
بندر نہ بوزہ
نہیں کچھ مکمل یہاں پر
ہر اک شے ہے آدھی ادھوری
سراسر عبوری
فقط اک تمسخر کی طفلانہ خواہش
خود اپنے تماشے کی لذت بھری بے نیازی

شرارت بھری ناصبوری
گدھے پر سواری کا اپنا مزا ہے
مِرے یار احمق فتوری!

میں اندھیرے میں اُگی مشروم ہوں

وہ عجب سا خواب تھا
اُس خواب میں آنکھیں بہت تھیں
سانپ جیسی، ٹکٹکی باندھے، مسلسل گھورتی
چاروں طرف سے
میری جانب دیکھتی، پھنکارتی
جھپکے بنا
یلغار کرتی آ رہی تھیں......

جانے کیا سونے سے پہلے کھا لیا تھا
کھاد آلودہ نباتاتی غذا،

دم پخت، مرچیلے مسالے دار کھابے،
پیکٹوں میں بند ماکولات، نوڈل
یا کوئی مخلوقِ آبی
یا کسی مُردار کے قتلے چکھے تھے
کچھ سمجھ آتی نہیں تھی
اس قدر معلوم تھا بس
نیند سے ماقبل السائے
بدن کا بیج رفتہ کی زمینوں،
نم رسیدہ تیرگی مارے زمانوں کے ملیدے کی
تہوں میں بو دیا تھا
تا کہ صدیوں تک پڑا سویا رہوں
اپنی کسی تعبیر میں کھویا رہوں
اُگنے سے پہلے تا ابد بویا رہوں میں

وہ عجب سا خواب تھا
اُس خواب میں آنکھیں بہت تھیں
جو اندھیرے میں ڈراتی تھیں ہمہ دم
میرے ہونے، کچھ نہ ہونے
اور سونے کا تماشا دیکھتی تھیں
تیرہ و مرطوب خاموشی کے خولِ بے بصر میں

میرے خوابوں، میرے آدرشوں کو پیہم توڑنے کا سوچتی تھیں
آخرش گھبرا کے آنکھیں کھول دیں میں نے
سیاہی سے بھرے مومی لفافے میں مقید
اک سفیدی سی مِرے اندر سے باہر آ رہی تھی
میرا اسفنجی بدن رغبت سے دنیا کھا رہی تھی!

روشن لمحے کا گیت

میں اس کی آنکھوں میں سپنے لکھوں گا
جو میرے دل میں ستارے بھرے گا
مجھ سے ہواؤں کی سرگوشیوں میں
گزرے زمانوں کی باتیں کرے گا
قیدی پرندوں کے پر کھول دے گا
تتلی کو چھوتے ہوئے جو ڈرے گا
بارش کے موسم میں آنسو چھپا کر
کھڑکی کے اس پار دیکھا کرے گا
اک روشنی کا سمندر سا ہو گا
روشن کنارہ لبالب بھرے گا
میں اس کی آنکھوں میں سپنے لکھوں گا
جو میرے دل میں ستارے بھرے گا

پھولوں، پھلوں اور سبزیوں کے لیے ایک نظم

زمیں سے خواب اُگتے ہیں
کئی رنگوں، کئی شکلوں کے
گہرے سبز، پیلے، بینگنی
ہلکے گلابی، سرخ، نارنجی
سنہرے، کاسنی، نیلے
ہوا میں لہلہاتے، بارشوں میں بھیگتے ہیں
سبزیوں، پھولوں، پھلوں کے روپ میں
موسم کی مرضی کے مطابق،
چھاؤں میں اور دھوپ میں
ہر حال میں، ہر تھال میں

خوش رنگ
آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں
ہم کو خوشبوؤں سے، ذائقوں سے آشنا کرتے ہیں
ان کو دیکھ کر
چہرے خوشی سے تمتماتے ہیں
دلوں میں جھلملاتے عکس اور مہتاب اُگتے ہیں
زمیں سے خواب اُگتے ہیں
کریپرز کی طرح ہر سمت
ہر دیوار، ہر چھت سے لپٹتے ہیں
فلک تک پھیل جاتے ہیں!

شاعر کا دل

شاعر کا دل
اتنا اچھا اتنا سچا
جتنا کوئی اور نہیں
جس میں کوئی چور نہیں
پھولوں کو جو آنکھیں سمجھے
سورج اوس میں جلتا دیکھے
دیکھے پیڑ، پہاڑ، پرندے
پتھر میں کوملتا دیکھے
دیکھے رات کی اندھی کھائی
چاند زمیں پر چلتا دیکھے

شاعر کا دل
اتنا اچھا اتنا سچا
جتنا کوئی اور نہیں
جس پر کوئی زور نہیں
نیلے شانت سمندر جیسا
جس کا کوئی چھور نہیں
کشتی، موج، مچھیرا، سیپی
ریت گھروندا، لڑکی کا دکھ
تتلی کا پر، مور کا آنسو
طفل محبت، درد رسیدہ
جیون رس کا اتنا رسیا
مدہوشی کے عالم میں بھی
مرگِ تمنا کے غم میں بھی
مایوس نہیں، کمزور نہیں
شاعر کا دل
اتنا اچھا اتنا سچا
جتنا کوئی اور نہیں!

پھاگن چیتر کے آتے ہی......

پھاگن چیتر کے آتے ہی
بیلیں رنگ برنگے پھولوں سے بھر جاتی ہیں
شام کی آنکھیں سپنوں سے
دن کے نتھنے
خوشبو کی لپٹوں سے
دیواریں چہروں اور دریچوں سے
دروازے درزوں سے
گلیاں باتوں سے
رستے قدموں سے
شاعر کا دل یادوں سے

سندر، شیتل نظموں سے
اور نظمیں لفظوں سے بھر جاتی ہیں
پھاگن چیتر کے آتے ہیں
بیلیں رنگ برنگے پھولوں سے بھر جاتی ہیں!

وہ دن تیری یاد کا دن تھا

وہ دن تیری یاد کا دن تھا
اُس دن میں بھول گیا
سانسیں لینا
لمحے ڈھونا
باتیں کرنا
کِھل کِھل ہنسنا
چُھپ کر رونا
لکھنا پڑھنا
جاگنا سونا

وہ دن تیری یاد کا دن تھا
اُس دن میں بھول گیا
جینا مرنا
کچھ بھی کرنا!

آشوبِ عمر میں خواہش کب مرتی ہے!

کب لوٹیں گے،
اُن وقتوں کی جانب کب لوٹیں گے
جب ہم خوابوں کو بھی پکڑ لیتے تھے
چھوٹی چھوٹی درزوں سے
اندر کے سارے منظر، پس منظر دیکھ لیا کرتے تھے
دیواروں سے کان لگا کر
روحوں اور سایوں کی
سرگوشیوں جیسی باتیں تک سُن لیتے تھے
پَل میں بُن لیتے تھے
ریشمی رشتوں اور کچّے دھاگوں کے تانے بانے

شالیں، کھیس اور اونی دستانے
ہاتھ بڑھا کر چُن لیتے تھے
کچے پکے بیر، لسوڑے
وقت کے پیڑوں پر جتنے پھل تھے
ہم سے کب اوجھل تھے
نگدی، پھلیوں اور بتاشوں کی لذّت ایسی تھی
جیٹھ اور ہاڑ کی دوپہروں میں
ٹوپے اور پڑوپیاں بھر بھر گندم ہٹی تک لے جاتے تھے
اغلم پغلم کھاتے تھے
آنکھ مچولی کے اتنے شائق تھے
چرخِ کبود کو چھونے کی خاطر
ایک ہی سانس میں ست رنگی قوس کی سیڑھی پر چڑھ جاتے تھے
دیو آسا بھاری بھرکم بادلوں سے لڑ جاتے تھے
تتلیوں اور پرندوں کے پر،
پھول اور پتّے
بستوں اور کتابوں میں رکھنے کا
ایک جنون سا ہوتا تھا
خواہش کی عمر کہاں ہوتی تھی
خودرَو اور جواں ہوتی تھی
ہر شے جیسے آبِ رواں ہوتی تھی

بے فکرے اور بہادر اتنے تھے
بھوکے پیاسے کھیتوں میں ٹڈی دل کو مارنے چل پڑتے تھے
مٹی سے بھرے بُوٹ اٹھاتے تھے تو
ہریالی کی چادر پر بَل پڑتے تھے
ہم پاگل تھے
اپنے آپ میں جنگل تھے
خاموشی میں بولتے رہتے تھے
تیز ہوا سے، شوکتے رہتے تھے
گھاس اُگے رستوں پر
دن بھر بھاگتے رہتے تھے
دھوپ میں جلتے رہتے تھے
جل تھل جل تھل بارش میں بھیگتے رہتے تھے
سب کہتے تھے
بھوت پریت کا سایہ ہے کہنہ سال حویلی پر
شام ڈھلے ایک برہنہ عورت پھرتی ہے
لے کر دیپ ہتھیلی پر
لیکن ہم کب ڈرتے تھے
جو من میں آتا تھا وہ کرتے تھے
پریاں ہم پر عاشق تھیں
ہم بھی اُن پر مرتے تھے

ایسی لَے میں گاتے تھے
ندّیاں نالے بِن ساون، ہی بھر جاتے تھے
ایک طلسمی دریا میں بہتے تھے
ہر اک بات پہ کہتے تھے
جو ہوگا دیکھیں گے
آج نہیں کل سوچیں گے……
کب لوٹیں گے،
اُن وقتوں کی جانب کب لوٹیں گے!!

چابی

تجھے یاد ہوگا
کہ بچپن میں چابی سے کیسے کھلونے گھماتے تھے
مٹی سے گھر بھی بناتے تھے
پیپل کی چھاؤں تلے ہم
حدیں باندھتے تھے، لکیریں لگاتے تھے
کمرے سجاتے تھے
چیزوں کو ترتیب دیتے تھے
خود ہی اٹھاتے تھے، خود ہی گراتے تھے
جھگڑوں کی، باتوں کی، رشتوں کی بنیاد رکھتے تھے
بستے بساتے تھے، جیتے تھے مرتے تھے

سب کچھ ہی کرتے تھے اُس گھر میں
فرضی تھا جو، جس کی چابی نہیں تھی
اور اب جو یہ گھر ہے
خیالی نہیں اک حقیقت ہے
بنیاد اس کی ہماری رفاقت ہے، قربت ہے برسوں کی
چابی سے کُھلتا ہے در اِس کا
لیکن یہ گھر کی نہیں دل کی چابی ہے،
بچوں کی ماما!
اِسے دل کے لاکر میں رکھنا
یہ چابی ہے دل کی، اِسے دل میں رکھنا!!

تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے

کہانی مِرے دل پہ آ کر رکی ہے
مِرا دل چلے گا
تو آگے بڑھے گا یہ قصہ زمین و زماں کا

مِرا دل تو تم کو پتہ ہے
ازل ہی سے ٹوٹا ہوا ہے
خود اپنی ہی دھڑکن سے روٹھا ہوا ہے
مِرا دل کہ جس نے ہر اک دل کا دکھ درد بانٹا
ہر اک دل مِرے دل سے پھر بھی گریزاں
مِرا دل ہر اک دل کا کانٹا

زمانہ

مِرا دل مٹانے کے درپے ہے
دنیا مِری لاش اٹھانے،
مِری خاک اڑانے کے درپے ہے
لیکن مِرے دل کے مرنے کی
تم کو خبر تک نہ ہوگی
کہ تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے
پڑھتے ہوئے کس کو معلوم ہوگا
کہ کیسے کوئی اپنے اندر کے گہرے گپھاؤں،
طلسمی بلاؤں سے لڑتا رہا ہے
خود اپنی صداؤں سے لڑتا رہا ہے
کہاں کوئی مارا گیا تھا
کہاں کوئی زندہ تھا، زخمی تھا
کس نے ابھی اور جینا تھا
کب کوئی مرحوم ہوگا
کہاں پیاس دریا سے چپکا کنارا بنی تھی
کہاں بادلوں کا ٹھکانہ تھا، بارش کہاں پر ہوئی تھی
کہاں برف باری
کہاں کوئی یخ بستہ ظالم ہواؤں سے لڑتا رہا ہے
مِرے دل میں کیا ہے کہاں نقش ہوگا

کہاں کس ورق پر مِرا خوابِ بے چشم مرقوم ہو گا

مِرا جرم یہ ہے
کہ میں نے کسی کو بھی اپنے مقابل نہ سمجھا
یہی وہ تمنا ہے جس کو مِرا دل نہ سمجھا
کہانی مِرے دل پہ آ کر رکی ہے
مِرا دل چلے گا
تو یہ وقت آگے بڑھے گا
یہ تاریخ بھی استعارہ بنے گی، اشارہ بنے گی
کسی داستاں کا
کسی سرزمیں کا، کسی آسماں کا ستارہ بنے گی
مگر کیا کروں میں، مِرا دل بضد ہے
یہیں رُک کے دیکھے گا انجام مرگِ نہاں کا
یہیں چھپ کے دیکھے گا چہرہ کسی یارِ نامہرباں کا

کہانی مِرے دل پہ آ کر رکی ہے
مِرا دل چلے گا
تو آگے بڑھے گا یہ قصہ زمین و زماں کا......!

DEAD-END

کبھی ایک لمحے سے آگے نہیں میں گیا تھا
کبھی ایک رستے سے آگے نہیں میں گیا تھا
کبھی ایک چہرے سے آگے نہیں میں گیا تھا
کبھی ایک سپنے سے آگے نہیں میں گیا تھا
کبھی ایک اپنے سے آگے نہیں میں گیا تھا

کسی دن چلیں گے!

کسی دن چلیں گے
کراچی
سمندر میں آنکھیں بہا کر
اُسے دیکھنے کی تمنا کریں گے
جو بچپن میں گھر سے چلا تھا
کہ شپ یارڈ دیکھوں گا
بحری جہازوں میں دنیا کے چکر لگاؤں گا
پیسے بناؤں گا
لیکن فلیٹوں، پلازوں کی دنیا میں
بجری اٹھاتے

کسی ریت کے ڈھیر میں کھو گیا ہے......

کسی دن چلیں گے
سمندر کنارے
اسے پھینکنے کے لیے
شہر کے زیرِ تعمیر سارے مکانوں کا کچرا
مرے دل میں بھرتا چلا جا رہا ہے!

الغیاث

مِری جاں مِری زندگی تُو کہاں ہے
یہاں میرے چاروں طرف رات کا در کُھلا ہے
اگرچہ
سرِ قوس و محراب آنکھوں کا روشن جہاں ہے
مگر خواب کی ہر سڑک پر
اندھیرے کا اژدر رواں ہے
مِری یاد کی سرزمیں
ابر و باراں سے خالی ہے، بے آسماں ہے
مِرے دل کے برباد گوشوں میں
آبادیوں کا دھواں ہے

مِری لاش بغداد و کابل کی گلیوں میں بے خانماں ہے
مِرا درد لکھتے ہوئے رو پڑا تھا
زمانے کا متروک پرماتما بھی
مِری نظم آنکھوں میں آنسو لیے سو گئی ہے!

تصویر کے آنسو

کہو، تم کہاں ہو؟
مرے دل کے سورج کہاں ہو؟
یہاں شب کی وحشت
ہر اک ٹی وی چینل پہ منظر کشا ہے
کہیں کوئی کتا
کسی لاش کو کھا رہا ہے
کہیں کوئی قیدی برہنہ کھڑا ہے
کہیں کوئی خودکش دھماکا ہوا ہے
ذرا دیر پہلے
جہاں روشنی کا پڑاؤ تھا

اور زندگی تھی
وہاں اب اندھیرے کا ڈسکو ہے،
مرگِ دعا ہے
الاؤ بجھا ہے
کوئی رو رہا ہے
مگر خواب زارِ تمنا میں آنکھیں نہیں ہیں
پرندہ سرِ شاخِ کچنار سُن ہو گیا ہے!

BONFIRE

آؤ سنواریں
سورج کی پلکیں
ماس جلائیں
ہڈیاں تاپیں
گودے کا سوپ بنائیں
جسم سنہرا کرلیں
روح گلابی
رنگ بھی گہرا کرلیں
دیپک راگ سنائیں
اگنی چورن کھائیں

ایک جھماکا ایسا ہو گا
سڑکیں اور فٹ پاتھ جلیں گے
مرنے والے، مارنے والے
سب اک ساتھ جلیں گے
کہتے ہیں، سر بچ جائے گا
ٹانگیں، بازو، ہاتھ جلیں گے!!!

اب مِری آنکھیں نہیں ہیں

اب مِری آنکھیں نہیں
بس خواب ہیں جو دیکھتے ہیں
ہر طرف پھیلے ہوئے
اپنے ہی جیسے خواب زادوں کو
ازل سے جاگتے سوتے
ابد تک بھاگتے، رُکتے
بکھرتے ٹوٹتے
بنتے سنورتے
بے بدن جسموں کے اندر روح بھر کر
سانس لیتے

زندگی کی دائمی روٹین میں
اسکول جاتے
کارخانوں، دفتروں میں کام کرتے
یا کسی جبری محاذِ جنگ پر جاتے ہوئے
دہشت پسندی ختم کرنے کے بہانے
آگ برساتے ہوئے
جانے سے پہلے
ماؤں سے ملتے ہوئے
بہنوں کے ماتھے چومتے
بچوں کو سینوں سے لگاتے
بیویوں کو پیار کرتے
لوٹ آنے کی دعائیں شیو کے سامان میں رکھتے ہوئے
کچھ بھول جاتے ہیں
مگر کہتے نہیں، روتے نہیں
بس جاگتے ہیں روز و شب سوتے نہیں
جاتے ہیں لیکن
لوٹ کر آتے نہیں!

خودکُش

بہت خوبصورت ہے دنیا کا چہرہ
بنائی ہیں جس نے یہ آنکھیں
وہی جانتا ہے
وہی جانتا ہے
کہ جینا ہے کس کو، کسے کب ہے مرنا
کسے کس جہنم میں جلنا ہے
برزخ میں کس کا پڑاؤ ہے، فردوس کس کے لیے ہے
تجھے کس نے نادیدہ جنت کی صورت دکھائی
نہیں کوئی جنت زمین وزماں کی حقیقت سے آگے
سبھی کچھ یہیں پر ہے سمجھے اگر کوئی

کچھ بھی نہیں اس جہاں کی حقیقت سے آگے
تجھے کن جہانوں میں جانے کی جلدی تھی
جن کے لیے تُو نے
خود کو مٹانے کی ٹھانی
تماشوں سے معمور
پھولوں سے، رنگوں سے لبریز
جیون سے بھرپور
بچوں سی معصوم دنیا کو
بم سے اڑانے کی ٹھانی!

مرگِ آسان

مجھے تم بلاؤ
تو میں تم سے ملنے بھی آؤں
تھکن کا لبادہ اتاروں
تمہیں جی بھر کے دیکھوں
بڑے خوبصورت سے لفظوں میں،
رنگوں میں ڈھالوں،
سنواروں، نکھاروں
مناظر میں آنکھیں گھماؤں،
ہوا کو پکاروں،
افق در افق بادلوں کو صدا دوں

کہ تم کو نیا کوئی ملبوس پہنائیں
روزِ ازل سے ملی سرد سنگین عریانیوں کو چھپائیں

یہی زندگی ہے
جسے ہم زمانے کی اتھلی تہوں میں
بہت گہرا کر کے سدا بھوگتے ہیں
سدا روگتے ہیں
اگر ہم اسے بھی کسی یارِ دلدار کے آگے ہاریں
بہت سادگی سے زمیں پر گزاریں
کسی آسماں کو نہ سر میں جگہ دیں،
نہ اتنا ابھاریں
تو کتنی بھلی، خوب رُوسی لگے
زندگی سے بھری زندگی
سرسری زندگی

ایک دیکھے نہ دیکھے ہوئے خوابِ کہنہ سے باہر
کبھی تم بلاؤ
تو میں دوڑ کر جاؤں ملنے
قدیمی حقیقت کے رتھ پر
کبھی تم جو آؤ

تو میں لان کے سارے پھولوں کو اس کی خبر دوں
گھنی سبز بیلوں کے اندر چھپے
خشک پتوں کو یکبارگی گدگدا کر ہلاؤں، گراؤں
جنھیں خود لگایا تھا،
جن پر ابھی بُور آیا تھا
اُن سارے پودوں کو اک غم زدہ سی مسرت سے دیکھوں
ہری گھاس کو چوم لوں،
اوس میں آنسوؤں کو ملاؤں
نباتاتی معصوم کیڑوں مکوڑوں کو چھیڑوں
ذرا دیر بچوں سے کھیلوں
ہوا کی طرح گنگناؤں ……

پرندوں کو دانہ کھلاتے بتاؤں
کہ میں جا رہا ہوں
اُسے دیکھنے
چُپ چپاتے، بتائے بنا دوستوں کو
جسے دیکھنے کی تمنا میں اس زندگی کو گزارا
کبھی بے وفا نے بلایا نہ پوچھا
مگر اب سنو، عین جینے کی رُت میں
کسی جان لیوا، اجل خیز ساعت کی آواز آنے لگی ہے

مجھے روکنا مت!
مری اصلی محبوبہ مجھ کو بلانے لگی ہے
جسے سوچتے سوچتے عمر ساری لگا لی
وہ دیکھو، مجھے خود گلے سے لگانے لگی ہے!!

پَن گھاوَ

چلتے چلتے یکدم
وقت کا دریا رک جاتا ہے
جسم کی کشتی
عمر کے پُر پیچ بھنور میں
ِگھر جاتی ہے
مٹی کی مٹی میں
سانس اکھڑ جاتی ہے
پانی کو پانی کھا جاتا ہے
درد کناروں تک آ جاتا ہے
روتے روتے

آنکھ پگھل جاتی ہے
جیتے جیتے جان نکل جاتی ہے
پَن گھاوَ رہ جاتا ہے
گہراوَ اور کٹاوَ رہ جاتا ہے
ساری خوشیاں، سارے غم
چہرہ، آنکھیں، لمس اور نم
رنگِ مرگ نگل جاتی ہے!

(پروین اور طاہر کے لیے، جواں مرگ فیضان کی یاد میں)

دائم انتظار میں رکھی ہوئی نظم

کبھی کوئی اپنا ملے گا
کبھی کوئی سپنا ملے گا
کبھی کوئی بے شکل پرچھائیں،
بے سر ہیولا ملے گا
کبھی کوئی خوش رنگ چہرہ ملے گا
کبھی کوئی آوازِ کہنہ مثالِ گُلِ شبَ کھلے گی
کبھی کوئی نوخیز لمحہ ملے گا

کبھی کوئی جنگل ملے گا
کبھی زرد صحرا، کبھی سبز بیلا ملے گا

کبھی کوئی برگد، کبھی کوئی پیپل ملے گا
کبھی عودِ غرقی، کبھی سرخ صندل ملے گا
کبھی صرف جدوار ہو گی
کبھی دار چینی، کبھی تیز پتے کے پیڑوں کا جم گھٹ ملے گا
کبھی جھاڑیوں کا شرر خیز ہامون ہو گا
کبھی خشک رقبہ ملے گا
کبھی آبنوسی درختوں کا خطہ ملے گا
کبھی آب و گل کا خمیرہ ملے گا
کبھی اوپلوں کا ذخیرہ ملے گا
کبھی کانِ جُود و سخا،
کبھی تاسِ سیمیں، کبھی احمریں زر،
کبھی جست، تانبا، کبھی محض پیتل ملے گا
کبھی اجنبی سرزمینوں پہ چلنا پڑے گا
کبھی کوئی اپنا علاقہ ملے گا
کبھی کوئی منزل بھی ہو گی
کبھی کوئی رستہ ملے گا

کبھی دھوپ شاخوں پہ ہو گی
کبھی کوئی سایہ ملے گا
کبھی خواب پورا نہ ہو گا

کبھی درد آدھا ملے گا
کبھی شام اپنے کناروں سے باہر بھی ہو گی
کبھی باغِ ظلمات روشن ملے گا
کبھی آفتابی سا دن بھی سیاہی میں لتھڑا ملے گا
کبھی رات گمبھیر ہو گی
کبھی دیپ ہاتھوں پہ جلتا ملے گا
کبھی چاند نیلا بھی ہو گا
کبھی تام چینی سا ابیض ستارہ ملے گا

کبھی کوئی دو آب پایاب ہو گا
کبھی کوئی گہرا ملے گا
کبھی راز پانی کا معلوم ہو گا
کبھی بادلوں کا ٹھکانہ ملے گا
کبھی جل پری گنگنائے گی بحرِ صدا میں
کبھی کوئی اپنے ہی ساحل پہ خاموش بیٹھا ملے گا
کبھی ہو گا یادوں کا جھرمٹ
کبھی کوئی تنہا ملے گا
کبھی پیاس آنکھوں میں ہو گی
کبھی لب پہ دریا ملے گا
کبھی اک سمک خور خونی درندہ،

کبھی ایک آبی پرندہ ملے گا

کبھی دشتِ خارا،
کبھی خوبصورت سیہ فام لیلی، کبھی قیس مجنوں ملے گا
کبھی معجزاتی زمانوں کی تکوین ہوگی
کبھی سُوقِ یوسف، کبھی عہدِ موسیٰ،
کبھی مرغِ عیسیٰ ملے گا
کبھی کوئی سچ کے لیے جان دے گا
کبھی جانِ شیریں کا رسیا ملے گا
کبھی کوئی روشن جبیں، دل کشا، دل کا اچھا ملے گا
کبھی روشنی کا جھروکا ملے گا
کبھی صبحِ کاذب کا دھوکا ملے گا
کبھی کوئی دیوار اونچی سی ہوگی
کبھی کوئی در نیم وا سا ملے گا

کبھی جیت ہوگی کسی کی
کبھی آسماں تک بھی ہارا ملے گا
کبھی عاشقوں، صوفیوں کا اُسارا ملے گا
کبھی خشتِ پختہ میں کاری گری سے بنایا ہوا نقش تازہ ملے گا
کبھی وقتِ رفتہ کا ملبہ ملے گا

کبھی سنگ ماہی،
کبھی سست رفتار کچھوے کا خولِ قدیمی
کبھی کن کھجورے کا ڈھانچا ملے گا
کبھی چوبِ خستہ،
کبھی کوئی دھاتی لبادہ ملے گا
کبھی کوئی صدیوں پرانا ارادہ ملے گا
کبھی خواہشوں کا برادہ ملے گا

کبھی چاکِ ارض و سما کا گھماؤ،
کبھی کوزہ سازوں کا آوا ملے گا
کبھی کوئی گل دان، مٹکا،
کبھی کوئی ہانڈی
کبھی کوئی کانسی کا برتن
کبھی کوئی مٹی کا باوا ملے گا
کبھی قاف پریوں، چڑیلوں کا جادو چلے گا
کبھی نارِ اصلی کا نقشِ کفِ پا ملے گا
کبھی وہ دکھائی نہ دے گا
کبھی وہ سراپا ملے گا
کبھی خود سے ہوگی ملاقات اپنی
کبھی تو وہ ہمزاد میرا ملے گا

کبھی کوئی مجھ سا بھی ہو گا
کبھی کوئی تجھ سا ملے گا

کبھی نظم کوئی مکمل بھی ہو گی
کبھی لفظ کوئی ادھورا ملے گا
کبھی دل یہ ٹوٹے گا اپنی تھکن سے
کبھی اک تسلسل سے چلتا ملے گا
کبھی کچھ نہ ہوگا زمیں پر
کبھی کائناتوں کا ریلا ملے گا
کبھی زندگی کا، کہیں سے تو آغاز ہوگا
کبھی مرگِ پیہم کا انتم کنارا ملے گا......!!

یاد کی خوشبو

تم جس خواب کا جادو لے کر
اپنے گیت بناتے ہو
تم جس آنکھ سے آنسو بن کر
اپنا درد بہاتے ہو،
بادل جیسے گِھر گِھر آتے ہو
تم جس یاد کی خوشبو سے
اپنی شام سجاتے ہو،
لفظوں کو مہکاتے ہو
تم جس پیڑ کی چھاؤں اوڑھے
دینہ نام کا گاؤں اوڑھے

رستہ رستہ، مٹی مٹی
اُگتے اور اگاتے ہو
دھوپ میں پھول کھلاتے ہو
برکھا، باد، پرندہ اور چھتری بن جاتے ہو
میں اُس خواب کے جادو
آنکھ کے آنسو
یاد کی خوشبو
اور اُس پیڑ کی چھاؤں سے
دُور دراز کے رستوں اور دشاؤں سے
بارشوں اور ہواؤں سے
ایک سنہری نظم بنا کر
روز تمہارے شہر کی سمت روانہ کرتا ہوں
ملنے کا بہانہ کرتا ہوں!

(گلزار کے لیے)

کشکولِ ازل

اک شام کا دریچہ
اک رات کا کنارا
اک آسماں ذرا سا
اک چاند اک ستارہ
اک تیرگی کا دھبّا
اک روشنی کا دھارا
اک آئنے کے پیچھے
اک عکس کا اشارہ
چھپ کر کھڑا ہے کوئی
لیکن ہے آشکارا

کمرے میں چھت بچھی ہے
آنگن میں ہے اُسارا
پانی کے ساتھ مِل کر
مٹی بنی ہے گارا
دیوار اُٹھ رہی ہے
بیٹھی ہے ماہ پارہ
یادوں بھری ہے گٹھڑی
جیون کا بار اُتارا
دو گز کی ہے ضرورت
اتنا بڑا پسارا
اے عمر کے فریبی!
پَل کا نہیں ہے یارا
پاتال میں گرا ہے
اونچائیوں کا مارا
ناحق ہتھیلیوں پر
قدموں کا دکھ ابھارا
دھوکا ہے کائناتی
کیا دوش ہے تمہارا
پھر بھی کبھی تو دیکھو
منظر ہے بے نظارہ

رنگوں کی راگنی میں
نیلا ہی کیوں ہے سارا
ٹھہرا ہوا ہے کب سے
اک تھال بے سہارا
بھرتا نہیں ہے خالی
نقصان ہو کہ وارا
کیا موت، کیا معیشت
ہے زندگی خسارہ
صدیوں سے ہیں معلق
اک ہاتھ، اک غبارا!!

کہیں ایک رستہ ملے گا

کہیں ایک رستہ ملے گا
جہاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہم
چلیں گے
طلسمی جہانوں کی جانب
ہوا سرسراتی ہوئی
پھول پتے اڑاتی ہوئی
گنگناتی ہوئی
ساتھ ہوگی
کبھی صبح ہوگی
کبھی رات ہوگی

کہیں ایک دریا خموشی سے بہتا ملے گا
قدیمی درختوں سے کہتا ملے گا
”مِرے سست رفتار پانیوں میں زمانوں کی تیزی ہے
میرے کناروں پہ آباد خوشحال شہروں کے نیچے مِری ریت ہے
میرے پانی سے نکلے رواں ہیں
مِری تہہ میں صدیوں کے دکھ ہیں
عجب آب و گِل کے جہاں ہیں
کوئی مجھ میں اترے تو جانے
مجھے پار کر کے تو دیکھے......“

مگر ہم چلیں گے
گھنے جنگلوں سے گزر کر
پہاڑوں کے اُس پار جائیں گے
درزوں، دراڑوں میں، غاروں میں جھانکیں گے
چلتے رہیں گے
جو شاداب سا سامنے کھیت ہے
فصلِ تازہ سے لبریز ہے
اس کے نیچے
محبت کی کاریز ہے
جس کے دم سے یہ ساری زمیں دل کی زرخیز ہے

تشنگی جسم کا بھید ہے، روح کا چھید ہے
فاصلہ ہے
یہاں سے وہاں تک بچھا ہے
خبر کیا کہاں تک بچھا ہے
کہیں ایک رستہ ترے میرے قدموں کے نیچے چُھپا ہے
اسے طے کریں گے تو آگے بڑھیں گے......

کہیں ایک لمحہ ہے
عمروں کا حاصل ہے
بوسیدگی سے بھرا اک مکاں ہے
کسی یادِ کہنہ کا جالا ہے، مکڑی ہے
سانپوں کا بِل ہے
کہیں ایک صدیوں پرانی سی ونڈ مِل ہے
جس کے گھماؤ میں
پانی ہے، پتھر کی سِل ہے
تِری سبز آنکھیں، مِرا سرخ دل ہے!!

کوئی خواب آنکھوں سے آگے بھی جاتا

کوئی خواب انکھوں سے آگے بھی جاتا
جہاں دید و نادید سب ایک ہیں
وقت گھڑیوں سے آزاد ہے
ساعتوں کا اجارہ نہیں
کوئی روشن ستارہ نہیں
تیرگی کے ابد کا سمندر ہے لیکن کنارہ نہیں

خواب آنکھوں کی حد سے گزرتے ہوئے ہچکچاتا ہے
ڈرتا ہے لاانتہاؤں سے
گہرے خلاؤں سے

یا پھر خداؤں سے
منظر سے باہر نکلتا نہیں
زاویہ تک تو اپنا بدلتا نہیں
ہاں، ذرا دیر چلتا ہے
رفتہ کے گاڑھے اندھیرے میں
صدیوں پرانے زمانوں کے پُل پر
مگر لوٹ آتا ہے
پھر حال کے خوشنما جال میں
پھر سے آنکھوں کی پاتال میں

خواب آنکھوں سے آگے جو جاتا
تو ہم کو بھی معلوم ہوتا
کہ نظروں کے پیچھے چھپے راز کیا ہیں
کہاں بے کواکب، مکمل سیہ رات کا شیڈ
ہے
تیرگی سے ورا دن کا زینہ کہاں تک
ہے
پاتال کی کن تہوں میں اترتا
ہے
تبدیل ہوتا ہے شب میں کہاں سلسلہ سُرمگیں شام کا
کس جگہ ٹوٹتا
ہے
یہ رسہ لٹکتے ہوئے دامِ اوہام کا
روشنی کی ندامت ہے کیا

رت جگا کیا ہے، سونے کی لذت ہے کیا!
خواب کے بعد آنکھوں کی حاجت ہے کیا!
خواب سے آگے خوابوں کی صورت ہے کیا!

خواب آنکھوں سے آگے جو جاتا
تو ہم پر بھی کُھلتے
ازل سے بھٹکتے ہوئے جسمِ خاکی کے اسرار کیا ہیں
بِلا خشت و دیوار بنتے مکاں کیا ہیں، معمار کیا ہیں
بدن کی دلیلوں سے آگے کے اظہار کیا ہیں
گُلابی حسینوں کے سربستہ انوار کیا ہیں
ہر اک سمت سے وار کرتی، امنڈتی نگاہوں کے انبار کیا ہیں
کبھی خواب آنکھوں سے آگے جو جاتا
تو ہم جانتے
خواب کے پیش کیا ہے، پسِ خواب کیا ہے
حقیقت ہے یا محض خوابوں کے ملبے سے پُر بار،
اِک چت خلا ہے
کوئی خواب آنکھوں سے آگے بھی جاتا
تو ہم دیکھتے
خواب کے پار کیا ہے؟
یہ در ہے کہ دیوار، کیا ہے؟

تم تو ہم سے ملنے آئے تھے

تم تو ہم سے ملنے آئے تھے، جاوید انور!
اور وہ نظم سنانے
جو تم نے کبھی لکھنی تھی
ارض وفضا سے دُور کسی گم گشت خلا میں
ایک ستارے کی صورت
اک وقفے کی پہنائی میں
ہونے اور نہ ہونے کے بیچ کہیں
بے سار زمانوں کی تنہائی میں

نظم جو تم نے لکھنی تھی

کشتی اور ملاح کے دل میں
آبِ رواں کی جھلمل میں
دُور بہت دُور کہیں
اُس پار کنارے کی صورت
لفظوں اور سطروں کے بغیر
رمز، اشارے کی صورت
جانے کس مرگ آسا کو بتا کر بھی چھپانا تھی
نہ سنا کر بھی سنانا تھی

بِن لکھی اور سنائی
نظم سنا کر کتنے خوش تھے، تم
جیسے ہم سب بچے ہوں
اور تمہاری نظم کا راز نہ سمجھے ہوں
کاش ہماری آنکھوں میں
کاغذ کی کشتی جیسی بھیگی اک نظم بھی تم پڑھ لیتے
ہم کو بھی معلوم تھا یارا
بِن لکھی اور سنائی نظم کہاں سے آتی ہے
اور کہاں گم ہو جاتی ہے
ہم بھی اک دیہاتی رات کی عریاں ویرانی میں
چاند اور تاروں کا اصلی چہرہ دیکھ چکے ہیں

ہم بھی اس تلخ نگوڑے میلے گدلے جیون کا
اُجلا بچپن ریکھ چکے ہیں

کاش مِلے بِن تم ملتے ،
ہم سے
اور دلوں کے جنگل میں
اَن دیکھے پھول کی صورت
دائم کھلتے
تم نا ملتے ، تم سے ملنے کی بس آشا ہوتی
پھوٹ پھوٹ کے یوں نظم نہ روتی !

(جاوید انور کی یاد میں)

اناپ

زمانے کی اپنی تہیں ہیں
انہیں کون پلٹے
ہمیں تو خود اپنے چٹانی بدن ہی سے فرصت نہیں ہے
جسے کھودتے کھودتے ہم نے
پاتال کی سب سے نچلی تہیں تک کھدیڑی ہوئی ہیں
کسی دن اچانک
بس اک آخری ضرب ایسی لگے گی
کہ چاروں طرف سے خلا پھوٹ آئے گا
روتا، ہمکتا، ابلتا لہو کی طرح بلبلاتا خلا
جسم کو کھینچ لے گا اندھیری کشش میں

نہ ہونے کی اپنی ہوس ہے
یہ ایسی خلش ہے، حمیت نہیں جس کی کوئی
کمیت نہیں جس کی کوئی
کہ ہوتے ہوئے بھی
حقیقت نہیں جس کی کوئی!!!

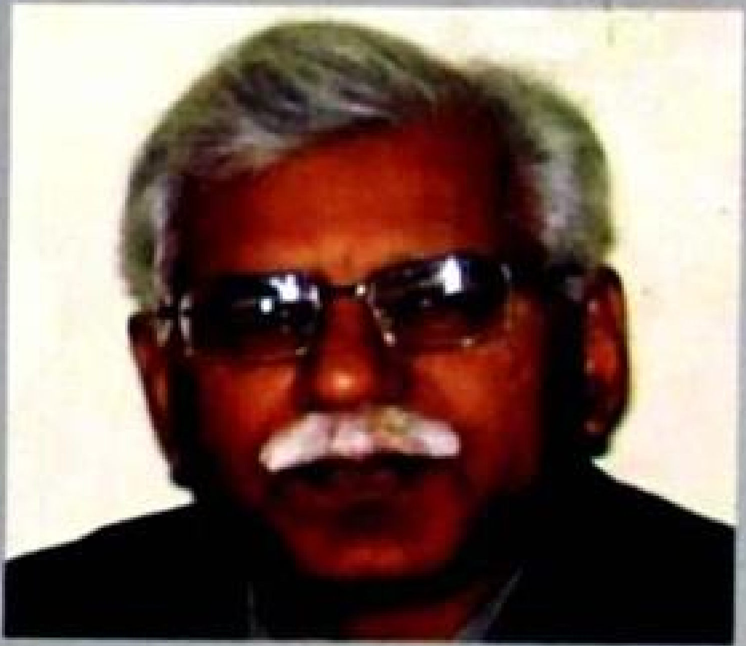

نصیر احمد ناصر کی دیگر کتابیں

عرابچی سو گیا ہے	نظمیں
پانی میں گم خواب	نظمیں
تیسرے قدم کا خمیازہ	نظمیں
زرد پتوں کی شال	ہائیکو
ظرفاب	غزلیں

نصیر احمد ناصر جدید اردو نظم کے انتہائی معتبر، صاحبِ اسلوب، رجحان ساز اور بین الاقوامی پہچان اور اہمیت کے حامل شاعر ہیں، جن کی نظمیں انگریزی، روسی، ہسپانوی، ازبک، رومانین، فارسی، ہندی اور دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ کم و بیش چار دہائیوں پر محیط نصیر احمد ناصر کی ادبی زندگی کسی بھی قسم کی منفی ادبی سماجیات، ستائشی تقریبات اور رونمائیوں سے بے نیاز حقیقی معنوں میں تخلیقی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ نصیر احمد ناصر کی نظموں میں نہ صرف روحِ عصر رواں ہے بلکہ ان میں کئی صدیاں سانس لیتی ہیں۔

نصیر احمد ناصر اپریل 1954ء میں ضلع گجرات کے ایک دُور افتادہ گاؤں ناگڑیاں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ زندگی کا طویل عرصہ کھاریاں میں گزارا اور گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں اور سی۔ بی ڈگری کالج کھاریاں کینٹ میں زیرِ تعلیم رہے۔ کچھ عرصہ ملک سے باہر اور میرپور آزاد کشمیر میں بھی رہے۔ اب مستقل طور پر راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔

سعید ابراہیم
2013

ISBN: 978-969-593-082-3

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com